⊙ جمیل الرحمٰن

پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

مکتوباتِ اقبال کا سیاسی وسماجی تناظر

Abstract:

It is the proven fact that Dr. Allama Muhammad Iqbal has an unending influence on literature, philosophy and socio-political history of the subcontinent .Not only the poetry, but lectures also reflect his philosophical thoughts. His letters are also very much important in this regard. They are undoubtedly an open perspective of Islamic culture, mysticism and socio-political worlds. In this article Iqbal's socio-political approach explicitly depicts through his letters has been addressed that might be helpful to understand Iqbal's socio-political insight.

Abstract:

Allama Iqbal Letters Socio-Political Perspective Sub-continent

مکتوباتی ادب میں اقبال کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اقبال نے اپنی گونا گوں صلاحیتوں اور دلچسپیوں کی بدولت عالمگیر شہرت حاصل کی۔شاعری، سیاست، سماجیات، معاشیات، مذہبی، دینی اور متصوفانہ پہلوؤں سے اگر اقبال کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔اگرچہ ان کے افکار وخیالات سے اختلاف کرنے والے کل بھی موجود تھے اور ان سے اتفاق نہ کرنے والے آج بھی پائے جاتے ہیں۔تاہم فکری موافقت اور اختلاف دونوں صورتوں میں فکر ونظر کے زاویوں کو جِلا ملی۔اقبال زندگی بھر تحرک، انقلاب اور تجدد کے لیے کوشاں رہے۔ان کی شاعری اور دیگر نثری تحریروں میں جا بجا یہ خیالات بکھرے پڑے ہیں۔فکرِ اقبال کسی ایک جامد نقطے پر رک نہیں گئی بلکہ وہ ہر دم تغیر وتبدل اور ارتقا پذیر رہی ہے۔اس ارتقا اور خیالات سے رجوع کے عمل پر اقبال کو مطعون قرار دینا قرینِ انصاف نہیں کیوں کہ حق وصداقت کی تلاش میں پوری ایمانداری سے سرگرداں رہنا اور کسی حقیقت کو صحیح، درست سمجھنے پر اپنے اعتقاد کو پختہ کر لینے کو دراصل ایک فکری استناد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔یہی کچھ ہمیں اقبال کے علمی، فکری سفر میں ملتا

ہے۔اگر برصغیر کے اس عہد کو ذہن میں رکھا جائے جب ظاہراً فرنگی استبداد نے ایک سوادِاعظم پر اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے باطناً سوچنے، سمجھنے، آگے بڑھنے اور اپنے شاندار ماضی، تاریخ اور روایت سے عملاً منہ موڑنے والی قوم دراصل مفلوج ہو چکی تھی۔فکرِ تازہ کا کیف آفریں جھونکا اقبالؔ کے قلب وروح نے فراہم کیا۔اقبالؔ ایک کثیر المراسلت شخص تھے۔زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات تک بلا مبالغہ ہزاروں خطوط اردو، انگریزی، جرمنی، فارسی اور عربی زبان میں لکھے۔قدیم ترین دستیاب خط مولانا احسن مارہروی کے نام ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل سے ۲۸رفروری ۱۸۹۹ء کو لکھا گیا۔آخری خط ۱۹رابریل ۱۹۳۸ء کا ہے جو ممنون حسن خاں کے نام لکھا گیا۔آخری برسوں میں ضعفِ بصارت کے سبب بقلم خود، جواب لکھنے سے قاصر ہو گئے تو املا کرا کے خود دستخط کر دیتے۔خطوطِ اقبالؔ کے کاتبین میں منشی طاہر الدین، میاں محمد شفیع، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، سید نذیر نیازی، مس ڈورانیٹ ویرا اور جاوید اقبال شامل ہیں۔(۱)

مکتوباتِ اقبال کے متعدد مجموعے سامنے آئے ہیں اور ان سب خطوط مطبوعہ وغیر مطبوعہ کو سید مظفر حسین برنی نے کلیاتِ مکاتیب اقبالؔ پانچ جلدوں میں مرتب کر کے پیش کیے ہیں۔علامہ اقبالؔ کی وفات کے بعد یہ مجموعہ ہائے خطوط شایع ہوئے:

۱۔ شاد اقبال، مرتبہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۔ اقبالؔ بنام شاد، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی
۳۔ اقبال نامہ (حصہ اول، دوم)، مرتبہ: شیخ عطااللہ
۴۔ مکاتیبِ اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان
۵۔ مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی، مرتبہ: بزمِ اقبال
۶۔ انوارِ اقبالؔ، مرتبہ: بشیر احمد ڈار
۷۔ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی محمد عبداللہ قریشی
۸۔ خطوطِ اقبالؔ، مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
۹۔ خطوطِ اقبال بنام بیگم گرامی، مرتبہ: سید حمید اللہ شاہ ہاشمی
۱۰۔ اقبالؔ نامے، مرتبہ: ڈاکٹر اخلاق اثر
۱۱۔ اقبالؔ ــــ جہانِ دیگر، مرتبہ: محمد فرید الحق
۱۲۔ مکاتیبِ سر محمد اقبالؔ بنام سید سلیمان ندوی
۱۳۔ اقبالؔ کے خطوط جرمن خواتین کے نام (اقبالؔ اکادمی پاکستان، لاہور)
۱۴۔ مظلوم اقبالؔ، مرتبہ: شیخ اعجاز احمد
۱۵۔ روحِ مکاتیبِ اقبال، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی
۱۶۔ نوادرِ اقبال بنام مہاراجہ کرشن پرشاد شاد، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی

اتنی بڑی تعداد میں لکھے گئے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنی شاعرانہ تساہل پسندی کے باوجود کاغذ وقلم کے

رشتے سے دست کش نہیں ہوئے اور وہ تواتر سے خط لکھتے اور موصول ہونے والے خطوط کے جواب دیتے رہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

''اقبال ایک بسیار گوشاعر تو نہ تھے مگر مکتوب نویسی کے بارے میں ان کی 'زود گوئی اور بسیار گوئی' سے انکار مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بلا مبالغہ ہزاروں ہی خطوط لکھے ہوں گے اور اس کا سبب ان کی عظیم الشان شخصیت ہے۔ اقبال ہندوستان کے علاوہ سمندر پار کے ملکوں میں بھی ایک قادرالکلام شاعر، مفکرِ اسلام اور سیاسی قائد کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ معاشرے کے ہر طبقے سے لوگ انہیں بکثرت خط لکھتے۔''(۲)

اقبال کے خطوط میں جہاں ان کی علمی ثقالت اور سنجیدگی کا عنصر غالب ہے وہاں وہ اپنے بے تکلف دوستوں، عزیزوں سے شگفتگی اور بے تکلفی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ موضوع کے اعتبار سے ہی ان کا قلم خط میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔ انتہائی مختصر اور طویل ترین خط اقبال کے مکتوبات کا حصہ ہیں۔ ان خطوط سے ان کی ذہنی اپج، سوچ، فکر کے ساتھ دل و دماغ میں انگڑائیاں لینے والے جذبات واحساسات پوری صداقت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اپنے خطوط میں کہیں بھی ابہام سے کام نہیں لیا اور کہیں بھی حجاب کا پہلو نظر نہیں آتا۔ ان کے خطوط میں ان کے شب وروز کے معاملات، مصروفیات، مشاغل، پسند و ناپسند، ماضی کے تذکرے، حال کی کیفیات اور مستقبل کے منصوبوں کی مکمل و جامع تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے ذریعے نہ صرف اقبال بلکہ ان کے بزرگوں، اعزہ واقربا، دوستوں، عزیزوں اور اولاد سے بھی تعارف حاصل ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اقبال کے خطوط ان کے یورپ، فلسطین، جنوبی ہند، افغانستان، دہلی، شملہ اور بلوچستان کے سفروں اور دوروں کی روداد بھی پیش کرتے ہیں۔(۳)

اقبال کے خطوط ہمدردی، خلوص، دل سوزی، قبول تنقید واصلاح، فراخ دلی وفراخ حوصلگی، علمی دیانت، شعر وسخن کی دلاویزی اور امتِ مسلمہ بارے بالعموم اور اسلامیانِ ہند کے سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی حالت پر اظہارِ تشویش کے خصائص سے متصف نظر آتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر اقبال کی وہ حیثیت ہے جسے آج قوم مفکرِ پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔ اقبال کا یہ اعجاز ان سے چھینا نہیں جا سکتا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید عشرت لکھتے ہیں:

''اقبال کے مکاتیب کا یہ سب سے بڑا اعجاز ہے کہ اس نے برصغیر کے مسلمانوں کے دوقومی نظریے کو ثقافتی اور تہذیبی تشخص عطا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ چنانچہ مسلم قومیت یا نظریہ پاکستان کی تفہیم میں اقبال کے خطوط ایک بنیادی حوالہ ہیں جو برصغیر میں ہماری تہذیبی اور تمدنی تشکیل کے تدریجی ارتقا کا بھی آئینہ ہیں کہ کس طرح اقبال کی صورت میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی شناخت اور تشخص کی بازیافت کی جوکھی لڑائی لڑی اور کس حکمت وتدبر سے ہندو اور انگریز کی سیاست کو مات دے کر اپنے لیے سلامتی اور بقا کی صورت نکالی۔۔۔۔ اقبال نے ان خطوط کے ذریعے پورے برصغیر میں یمین ویسار پیدا کر کے ایک زبردست تحریک کے اسباب فراہم کیے اور

علمائے سیاسین سے لے کر عام لوگوں تک میں قوت اور اعتماد پیدا کیا جس سے انگریز اور ہندو کے
خلاف لڑنے کے لئے مسلمانوں میں اخلاقی اور مادی طاقت پیدا ہوگئی جو قائداعظم کی قیادت میں
ہمارا روشن مستقبل وجود میں لائی۔''(۴)

سقوط دہلی کا دل خراش تذکرہ میرؔ وغالبؔ تک محدود نہیں تھا، اس کا قلق اقبالؔ کو بھی تھا۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا نشان جوز میں بوس ہو چکا تھا۔ اقبالؔ دہلی کا تذکرہ غالب کے حوالے سے کرتے ہوئے مولوی انشاءاللہ کو لکھتے ہیں:

'' مخدوم ومکرم مولوی صاحب! السلام علیکم
آپ سے رخصت ہو کر اسلام شان وشوکت کے اس قبرستان میں پہونچا جسے دہلی کہتے ہیں۔۔
خواجہ سید حسن نظامی اور نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔۔۔۔ خواجہ صاحب
موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس
پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش
آواز لڑکا ولایت نام تھا اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی کچھ
ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہوگئیں۔ بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پرنم ہوگئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے
رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔'' (۵)

اس عہد میں ہندوستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہندو، مسلمان اور دیگر اقوام ہندوستان اپنی اپنی سطح پر اپنے اپنے انداز میں تحاریک برپا کر رہے تھے۔ ان تحریکوں میں سودیشی تحریک اب تاریخ کا حصہ ہے جس کے مطابق برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی تحریک دی گئی تھی۔ منشی دیانراین نگم جو اخبار 'زمانہ' کے ایڈیٹر تھے کے سودیشی تحریک پر کیے گئے سوالات پر اپنی رائے کا سیاسی بالغ نظری سے جواب دیتے ہوئے لکھا:

''۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ امریکہ اور جرمن کی چیزیں خریدو مگر انگلستان کی چیزوں
کو ہندوستان کے بازاروں سے خارج کر دو۔ مجھ کو تو اس کا اقتصادی فائدہ کچھ نظر نہیں آتا بلکہ
اگر انسانی فطرت کے محرکات پر غور کرو تو اس میں سراسر نقصان ہے۔ اس طریقِ عمل سے تو یہ
معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے ہم کو سخت نفرت ہے نہ یہ کہ ہم کو ہندوستان سے محبت ہے۔ اپنے
وطن کی محبت کسی غیر ملک کے مستلزم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اقتصادی لحاظ سے اس میں کچھ فائدہ
نہیں ہے۔''(۶)

آگے چل کر وہ اس بارے قابل عمل حقیقت پسندانہ تجاویز دیتے ہوئے لکھا کہ ان باتوں کا خیال رکھا جائے پھر مثبت نتائج برآمد ہونے کی امید کی جاسکتی ہے:

'' ا۔ وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کی کمیت اور کیفیت کیا ہے؟

ب۔ وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوتی تھیں اور اب تیار نہیں ہوتیں؟

ج۔ وہ کون کون سی مصنوعات ہیں جو ہم خصوصیت سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں؟

د۔ ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لیے موزوں ہیں۔''(۷)

ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستان کے دوش بہ دوش عالمی اسلامی سیاست اور اتحاد ملی کے لیے کوششیں کیں۔ اسی طرح کی ایک کوشش مصر میں ایک کانفرنس کا انعقاد تھا۔ علامہ صاحب اس کانفرنس کے سیاق وسباق پر تقابلی نگاہ ڈالتے ہیں اور وہ امت مسلمہ کو ایک مرکز کی طرف بلاتے ہیں جسے خانہ کعبہ کہا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

'' مصری کانفرنس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ یہ تجویز مسلمانانِ عالم کی قومی اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے دو سال پیشتر علامہ عصر نسکی ایک روسی اخبار نویس کی تحریک پر دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی گئی تھی لیکن اس بحث کے تھوڑے ہی عرصے بعد ٹرکی اور ایران میں انقلاب کے آثار نمایاں ہو گئے اور مسلمانوں کی توجہ اور طرف مبذول ہو گئی۔ ٹرکی کی حالت ابھی تک قابل اطمینان نہیں اور کچھ عجب نہیں کہ کوئی عظیم الشان تغیر اس ملک میں پھر ہو۔ ایران ابھی انقلاب کے مرحلے سے نہیں گزر سکا۔ مراکو کی حالت سخت مخدوش ہے غرض کہ موجودہ حالات میں اسلامی دنیا پولیٹیکل انقلابات سے آزاد نہیں، پھر کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد کیا جاتا۔ حال کے مصری اور ٹرکی اخباروں میں جہاں تک مجھے معلوم ہے اب اس پر کوئی لکھنے والا بحث نہیں کرتا لیکن جو مقصد اس قسم کی کانفرنس سے پورا ہو وہ مکہ معظّمہ کی سالانہ کانفرنس سے ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان اس سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے۔'' (۸) (بنام گوہر علی خاں)

وہ تا عمر ایک حسرتِ ناتمام امتِ مسلمہ سے متعلق دل میں پالتے رہے۔ اکبرالہٰ آبادی سے انہیں خصوصی نیاز اس نسبت سے حاصل تھا کہ دونوں کے دل امتِ مسلمہ کی اصلاح، ترقی وترویج کے لئے یکساں دھڑکتے تھے۔ فتحِ ترکی کی خبر اکبرالہٰ آبادی نے سنائی تو انہیں جواباً تحریر کرتے ہیں:

''ترکوں کی فتح کا مژدہ جانفزا پہنچا۔ مسرت ہوئی مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔'' (۹)

تقسیم بنگال اور تنسیخ بنگال انگریز سیاست کا وہ جال تھا جس کے دام میں ہندو، مسلم دونوں قومیں گرفتار اور باہم دست وگریباں ہو گئیں۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ ڈرامار چایا گیا جس کا پردہ چاک کرتے ہوئے اقبال عطیہ فیضی

کو لکھتے ہیں:

''بنگال کی تقسیم۔۔۔مسلم بنگال کی ہندو بنگال سے علیحدگی۔ بنگالی ہندو کے خیال میں ایک کاری زخم تھا جو حکومت نے بنگالی قومیت کے قلب پر لگایا۔۔۔لیکن حکومت نے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلہ کی خود ہی کمال ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی۔ بنگالی سمجھتا ہے جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔اس مسئلہ سے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں:

مندمل زخم دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی'' (۱۰)

ایرانی تہذیب کے برصغیر کے سماج پر معاشرتی، مذہبی اور ادبی اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ان اثرات کے مثبت پہلو بلا شبہ موجود ہیں اس کے توسط سے مسلمانوں کو ہاتھ لگنے والا عجمی تصوف اسلامی تصوف سے مس نہیں کھاتا۔ منفعل اور مجہول متصوفانہ تعلیمات کی بدولت بالعموم مسلمانوں میں فراریت، عمل سے گریز اور زندگی سے بے اعتنائی کا رویہ زوال، پستی اور تباہی کی طرف لے گیا۔اقبالؔ کو اس کا قلق تھا اور اس کے مزید سرایت کر جانے کے خوف سے انہوں نے اسرار خودی کے پردے میں مسلمانانِ ہند کو گراں خوابی سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔اس کارِ دشوار میں ان پر کفر و الحاد کے تازیانے برسائے گئے لیکن انہوں نے جس بات کو حقیقت سمجھا اسے کتمانِ حق کی سیاہی سے داغ دار نہیں کیا۔اس سماجی و سیاسی تبدیلی لانے کی خواہش کا اظہار منشی سراج الدین کو ایک خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ان کو عرب اسلام سے اور اسے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی۔صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔انشاءاللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔''(۱۱)

اس بے عملی پر مبنی محض فلسفیانہ تصوف اسلامی دنیا میں رہبانیت کو دخل دینے کے مترادف تھا۔خواجہ حسن نظامی جو خود سلسلۂ تصوف کی اہم کڑی تھے اور اس مسئلے پر اقبالؔ، خواجہ حسن نظامی کے مابین کافی بحث رہی ہے۔ان کو لکھتے ہیں کہ حالیہ اسلامی دنیا میں رائج تصوف دراصل رہبانیت کی ہی ایک کڑی ہے:

''رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوتی ہے اور ہر جگہ اس نے

شریعت اور قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے۔ اسلام حقیقت میں اسی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا (اور تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ قرامطی تحریک سے بھی تصوف نے فائدہ اٹھایا محض اس وجہ سے کہ قرامطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔''(۱۲)

اقبالؔ فطری طور پر تصوف کا میلان لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ رہبانیت آمیز تصوف کے کدو کو اپنے منہ سے لگا لیتے لیکن یہ ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ تصوف کی سرے سے تکذیب نہیں کرتے بلکہ اس کے اسلامی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی رویوں کو فرد اور سماج دونوں کے لیے باعثِ خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ بے خودی میں بھی اس لطیف فرق کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ تصوف کے اس روشن پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے خان محمد نیاز الدین کو لکھتے ہیں:

'' تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاثرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدہ (کی) طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا حالانکہ اسلامی نقطۂ خیال سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض از دیادِ یقین و استقامت ہے۔''(۱۳)

اقبالؔ اسی 'شرابِ کہن' کے جویا تھے جو عرب کی سرزمین سے کشید ہوئی تھی۔ ان لمحوں کی یافت کا ہمراز خان محمد نیاز الدین خاں کو بناتے ہیں جو ان کی رومانیت پر دلیل ہے:

''میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیل میں قرونِ اولیٰ کی سیر۔ مگر خیال کیجیے جس زمانے کا تخیل اس قدر حسین و جمیل روح افزا ہے وہ زمانہ خود کیسا ہوگا:

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدارِ عام تھا اس کا'' (۱۴)

اقبالؔ عجمی تصوف کے مضرات سے مسلم امہ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ عالمی سطح پر وہ نظریۂ قومیت (Nationalism) کو انسانیت کے باب میں سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ یہی وہ جاہلانہ عصبیت تھی جس نے رنگ و نسل اور جغرافیائی تکثیریت کے ہاتھوں کشت و خون کی وادی میں انسانیت کو دھکیل دیا۔ اس کی گواہ دو عالمگیر جنگیں اور لمحۂ موجود تک بربادی و تباہی کا نہ رکنے والا سلسلہ ہے۔ خون کے یہ دھبے بارشوں سے دھلنے سے رہے۔ اقبالؔ مہاراجہ کشن پرشاد کو یہ سطور لکھتے ہیں:

'' علمِ موسم کے ماہرین بہت بارش کی پیشن گوئی کرتے ہیں اور ہونی بھی چاہیے کہ خون کی بارش

نے جو جسے چادرِ ہستی پر لگا دیے ہیں وہ دھل جائیں۔'' (۱۵)

ان کے نزدیک مغربی نظریۂ قومیت تارِ عنکبوت کی طرح بے حیثیت ہے۔ بدقسمتی سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی دلفریبیوں میں گرفتار نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں اس مضمون پر بڑی مضبوطی سے استدلال بہم پہنچایا ہے۔ خان محمد نیاز الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں:

> '' ۔۔۔ نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصولِ حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں، جن کی پختگی اور پایداری مرورِ ایام، اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔'' (۱۶)

اقبالؔ نے ہر مقام پر مشرق ومغرب کا تقابل کیا ہے چاہے وہ سیاست کا میدان ہو یا پھر معاملاتِ محبت و عقیدت ہوں۔ اقبالؔ نے ہمیشہ علیٰ وجہ بصیرت محبت واحترام کے تمام رشتوں کو پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے نبھایا۔ اپنے والد، بھائی کا تو وہ حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ انھی رویوں اور مزاجوں کا پھیلاؤ وہ اپنی معاشرت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کو ان الفاظ میں اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں:

> ''واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے ان کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔ پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا، دورانِ گفتگو میں کہنے لگے ''معلوم نہیں، بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے'' اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بے ہوش گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درسگاہوں میں ان کا نشان نہیں۔''(۱۷)

مظلوم اقبال مُرتبہ شیخ اعجاز احمد کے بیشتر خطوط اقبال کی خانگی زندگی اور گھریلو معاملات، رشتوں کے رچاؤ سے معمور ہیں۔ اقبالؔ کے خطوط میں دوستی، دلداری اور زندگی کی تمام تر ہما ہمی آنسوؤں اور مسرتوں سے لبریز لمحات کی سچی تصویریں موجود ہیں۔ ان کی بیماریاں، عدالتی، قانونی معاملات، ادبی سرگرمیاں، فلسفیانہ مباحث اور جمال دوستی کے اظہاریے ان خطوط میں جگہ پاتے ہیں۔ کیف ومستی کے ساتھ ساتھ ہشیاری وپرکاری کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆ (بنام خان محمد نیاز الدین خاں)

> '' کبوتروں کے دو جوڑے جو آپ نے بکمال عنایت فرمائے تھے۔ ان میں ایک جوڑا بچے نہیں دیتا، انڈے توڑ دیتا ہے اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے۔ دوسرے جوڑے نے بچے دیے۔ مگر ان میں سے دو جو بہت اچھا اڑتے تھے، شکاری جانوروں کا شکار ہو گئے، ایک باقی ہے، جوڑے میں نر ضعیف اور کمزور ہے، امید نہیں دیر تک زندہ

رہے، بہتر یہ ہے کہ چند بچوں کے جوڑے بھجوایئے، اگر ممکن ہو تو۔۔۔ میں نے لدھیانے بھی لکھا ہے اور شاہجہان پور سے بھی انشاءاللہ کبوتر آئیں گے۔'' (۱۸)

☆ (بنام مولانا گرامی)

'' ۔۔۔ میری خبر کے لیے آپ آ چکے۔ اگر میں لاہور میں مرا اور آپ اس وقت میاں میر میں ہوئے تو میں اپنے ورثا کو وصیت کر جاؤں گا کہ مولانا گرامی کو اطلاع نہ دی جائے تا کہ ان کو سفر کی تکلیف نہ ہو۔'' (۱۹)

☆ ''۔۔۔ بارے آپ نے اس نئے بخار کا مزا چکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس جس کو یہ بخار آیا ہے اس کی عمر میں بقدر اسی سال کے اضافہ کیا گیا ہے۔ سو آپ مطمئن رہیے آپ استخواں شکنی کے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ کسی پرانے بزرگ کا شعر ہے:

' قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی' سو فرق اس قدر ہے کہ بعض پیر بڑے بڑے لوگوں کی دلالی کرتے ہیں۔ بعض چھوٹے لوگوں کی۔ بہر حال یہ مشغلہ آپ کے لیے موزوں ہے اور شاعری بھی تو ایک قسم کی خدا اور بندوں کے درمیان دلالی ہے، اوپر سے الہام ہوا بندوں تک پہنچا دیا گیا۔ جس کو اس پیشے کی شرافت میں شبہ ہو، وہ کافر ہے۔'' (۲۰)

☆ (بنام مہاراجہ کشن پرشاد)

'' یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی معرفی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنو کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے۔'' (۲۱)

☆ (بنام شاد عظیم آبادی)

''۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لیے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ آپ کو ان کی تکمیل کے لیے دیر تک سلامت رکھے۔ جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔'' (۲۲)

☆ (بنام مہاراجہ کشن پرشاد)

''خوبصورت کرسمس کارڈ (کے لیے) جس سے سرکار کی ملاقات بھی ہر سال ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ سراپا سپاس ہے۔ مبارک باد کا تار تو بھیجا تھا مگر مفصل عریضہ لکھنے کی نوبت نہ آئی اس کی وجہ یہ کہ اب کے میں خود بھی اہل لاہور کے اصرار سے پنجاب کونسل کے الیکشن میں گرفتار تھا۔

الحمداللہ کی تین ہزار کی مجارٹی سے کامیاب ہوا اور اب فرصت پا کر یہ عریضہ سرکار والا کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔'' (۲۳)

☆ (بنام اکبرالہ آبادی)

'' میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔''(۲۴)

☆ (بنام مہاراجہ کشن پرشاد)

'' ایک معصومہ پنجاب میں رہتی ہیں۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ حسن میں لاجواب ہے اور اپنے گذشتہ اعمال سے تائب ہو کر پردہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ چند روز ہوئے اس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو۔ تمھاری نظم کی وجہ سے تم سے غائبانہ پیار رکھتی ہوں اور میری توبہ کو ٹھکانے لگا دو۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں۔''(۲۵)

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے خطوط ایک رخے نہیں ہیں۔ غالبؔ کے بعد اقبالؔ دوسری شخصیت ہیں جن کے خطوط سے ایسے منتشر اجزا کو علاحدہ کر کے ان کی سوانح مرتب کی جا سکتی ہے اور ان کی فکری پس منظر سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ اقبالؔ نے سماجی تفاعل اور سیاسی شعور کا اظہار ان خطوط میں کیا ہے۔ بہت سے نزاعی پہلوؤں پر انہوں نے بے باکی کے ساتھ لکھا ہے۔ چاہے وہ ردِ قادنیت ہو یا پھر ردِ بالشویک ازم، اقبالؔ کے جناح کے نام انگریزی میں لکھے خطوط اس وقت کی عصری سیاست کے گواہ ہیں۔ اقبالؔ کے مخاطبین کا تعلق ہر مذہب، ملت، ہر طبقے ہر مشرب سے ہے۔ گویا یہ خطوط ان مختلف سماجی سیاسی طبقوں کے مابین مکالمے (Dialogue) کا عمدہ اظہار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ زیب النسا، اقبال کی اردو نثر: ایک مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ص۱۲۴

۲۔ رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال (لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۶ء)، مرتبہ، ص۳۰

۳۔ ایضاً، ص۶۰

۴۔ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد اول (لاہور: ترتیب پبلشرز، س۔ن)، مرتبہ، ص۳۔۴

۵۔ خطوطِ اقبال، ص۷۶۔۹۲

۶۔ نقوش اقبال نمبر (لاہور، ستمبر ۱۹۷۷)، ص۴۷۸۔۴۷۹

۷۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد اول، ص۱۱۱۔۱۱۲

۸۔ ایضاً، ۲۰۱۔۲۰۲

۹۔ اقبال نامہ، مُرتبہ: شیخ عطاالله جلد نمبر، ص۳۹

۱۰۔ خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی۔ انگریزی (دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۷ء)، ص۷۷

۱۱۔ انوارِ اقبال (کراچی: اقبال اکادمی، ۱۹۶۷ء)، ص۱۶۱۔۱۶۲

۱۲۔ خطوطِ اقبال، ص۱۱۹

۱۳۔ مکاتیبِ اقبال بنام خان محمد نیازالدین (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۵۴ء)، ص۳

۱۴۔ ایضاً، ص۲

۱۵۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال۔ جلد اول، ص۴۴۲

۱۶۔ ایضاً، ۴۴۴

۱۷۔ ایضاً، ص۵۲۱۔۵۲۲

۱۸۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال۔ جلد دوم، ص۷۹

۱۹۔ ایضاً، ص۱۸۹

۲۰۔ ایضاً، ص۳۶۲

۲۱۔ ایضاً، ص۳۷۴

۲۲۔ خطوطِ اقبال، ص۱۷۱

۲۳۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال۔ جلد دوم، ص۴۸۵

۲۴۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال۔ جلد اول، ص۲۱۳۔۲۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص۳۳۷